حیاتِ قادر

مؤلف

عبید اللہ دُرّانی

باب نمبر ۱۵

ارشادات

قرار۔ کائنات میں کسی چیز کو بھی قرار نہیں۔ ہر شے کا دل بے قرار ہے۔ چاہے وہ انسان ہو یا کچھ اور۔ چرند ہو یا پرند۔ زمین ہو یا آسمان۔ پہاڑ ہو یا دریا۔ ہر ایک قرار چاہتا ہے اور قرار کی طرف دوڑتا ہے کہ شاید اس چیز سے ملے یا اُس چیز سے۔ بھوکا کھانے کی طرف بھاگتا ہے اور پیاسا پانی کی طرف۔ اور عاشق معشوق کی طرف۔ مگر نہ خود ''کھانے'' ہی کو قرار ہے نہ ''پانی'' کو اور نہ ''معشوق'' کو قرار صرف حق کو حاصل ہے۔ جس دل میں حق پوری طرح سمایا ہو وہی حی القیوم کا مصداق ہوتا ہے۔ ہر چیز کا فطری طور پر حق کی طرف کھنچ کر آنا لازم ہے۔ قرآن بھی فرماتا ہے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

تشریح:۔ صبر و توکل جو فقیر کی فطرتِ ثانیہ بن جاتے ہیں حق کے فیضان کا راستہ کھول دیتے ہیں۔ تجسس و تردد اور کوشش جو عموماً نفس کی تاویلیں ہوتی ہیں فیضان میں رکاوٹ پیدا کرتی ہیں۔ اللہ پر بھروسہ رکھنے والا ان سے پاک ہو جاتا ہے۔ صراط مستقیم کی شاہراہ اس کے سامنے کھلی ہوتی ہے۔ اور وہ روح قلب اور لطیفہ نفس کو ساتھ لئے ہوئے حق تک پہنچ جاتا ہے۔

۲۔ روشن ضمیری:

دل میں خواہ دیا سلائی ہی کیوں نہ رکھی ہو مگر جب تک رگڑی نہیں جاتی آگ پیدا نہیں ہوتی۔ لکڑی سے لکڑی کو اگر خوب رگڑیں تو اس میں بھی آگ پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر ہر سلائی سے ایسا نہیں ہوتا۔ یہ ریاضت کی رگڑ ہے۔ یہ من و تو کی رگڑ ہے۔ میں خارج تو داخل ہے۔ سینچتے جائیں۔ جب پُر ہو جائیں تو اچانک تکمیل ہو جاتی ہے۔ باطن روشن ہو جاتا ہے۔ ماوراسب آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے۔ علم لدنّی اسی کا نام ہے۔ دنیا کی ہوا اس کو بجھانے کی کوشش کرتی ہے مگر جو آگ اچھی طرح جڑ پکڑ جائے یہ اسے بجائے بجھانے کے اور بھی بھڑکاتی ہے۔

تشریح:۔ خود اگر انسان چاہے کہ غیب کے راز روشن ہوں تو وہ اپنی خواہش اور اپنی کوشش سے کبھی نہیں ہوتے۔ مگر جب خود میں خودی نہ رہے اور قلب میں جلا ہو تو یہ آئینہ ماضی، حال، مستقبل تینوں حالتوں کی ایک جیسی عکاسی کرتا ہے۔ اور اگر

انسان سلوک میں ہو تو ان چیزوں کا ہوش بھی رہتا ہے۔ لطیفہ نفس سے جو قایم لطیفہ قلب میں ہو جاتا ہے تو ادھر روح اور عالمِ امر اور اُدھر نفس اور عالم اسباب دونوں ہی کی عکاسی کرتا ہے۔ عالمِ مثال کی دنیا میں قلب بس رہتا ہے۔

۳۔ ملّت:

دوپہر کے کھانے پر کسی میٹھے کھانے پیر ایک دفعہ خشخاش چھڑکی ہوئی تھی تو فرمانے لگے۔ دیکھو یہ خشخاش کتنی چھوٹی چیز ہے۔ یہ افیون کے پودے کا بیج ہے۔ افیون کے کھیت بلاسپور کی طرف ہوتے ہیں۔ کھیتوں کے اطراف لوہے کا جال ہوتا ہے اور مسلح پولیس کا پہرہ رہتا ہے۔ اندر صرف وہ لوگ کام کر سکتے ہیں جو خود افیون کھاتے ہوں۔ ان لوگوں کو کام کرنے میں بے حد خوشی اور سرور محسوس ہوتا ہے۔ یہ لوگ عام طور سے مسلمان ہی ہوتے ہیں لوہے کے ناخنوں سے پھل کو کھرچتے ہیں اور اس کا سوکھا ہوا دودھ جمع کر لیتے ہیں۔ پھر آپ نے فرمایا ۱۹۲۷ء کا ذکر ہے جب میں اننت گری گیا تھا۔ وہاں کافی کا کنٹریکٹر ایک اینگلو انڈین کالے شاہ نامی تھا۔ اس نے لے جا کر سارے باغات اور فیکٹری دکھائی تھی۔ کافی کا درخت سلور اوکس کے سایہ میں ہوتا ہے۔ اس کا پتا بھی سفید اور پھل بھی سفید ہوتا ہے۔ کافی کے پھل بالکل سرخ ہوتے ہیں اور گچھے لٹکے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان پھلوں کو پہاڑی لوگ توڑ کر ڈھیر کے ڈھیر جما لیتے ہیں۔ تھوڑی سی دھوپ کھا کر یہ پھل کمہلا جاتے ہیں تو پکا کر ایک بڑی مشین کے پیپے میں جھونک دیئے جاتے ہیں اور مشین ہاتھ سے چلائی جاتی ہے۔ کسی بیل یا جانور سے نہیں۔ مشین بڑے زور سے کٹ کٹ آواز کرتی ہے جو بڑی دور تک سنائی دیتی ہے۔ مشین میں سے ایک طرف سے بیج اور دوسری طرف سے چھلکے خارج ہوتے ہیں۔ چھلکے نہایت سخت ہوتے ہیں۔ ہڈی سے بھی کہیں زائد سخت۔ بیج ہرے رنگ کے ہوتے ہیں اور بالکل تیار۔ کچھ اور کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ٹاٹ کے تھیلے میں بھر کر وجے نگرم ایجنٹ کے پاس بیل گاڑی میں روانہ کر دیتے ہیں جہاں پر یہ جانچے اور تولے جاتے ہیں۔ جب ضرورت ہو تو ان بیجوں کو ذرا بھون کر پیس کر کافی تیار کر لی جاتی ہے۔ باباصاحب نے کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا۔ ”اسی فارم کے کنارے آٹھ صندل کے درخت تھے ان میں سے کسی کو نہیں کاٹا گیا تھا اندر جنگل میں صندل کے دس ہزار سے بھی زیادہ درخت ہیں۔ یہ سب حکومت کے ہیں۔ کالے شاہ نے ایک پہاڑی آدمی کو کسی درخت کا پتہ دے کر بھیجا تھا کہ اس کو کاٹ کر جڑوں سمیت لے آئو۔ کیونکہ ان لوگوں کو شناخت ہوتی ہے کہ کون سے درخت خوشبو دار ہوتے ہیں۔ اس درخت کا تنا ایک ہاتھ سے دو تین انگل کم تھا اور اس میں تین موٹی موٹی جڑیں تھیں۔ باقی باریک جڑوں کو چھانٹ کر صاف کر دیا گیا تھا۔ صرف ان تین جڑوں کو علیحدہ کر کے کچھ جنگل کی گھاس کے ذریعہ تنے سے باندھ دیا گیا اور ہمارے ساتھ موٹر پر رکھوا دیا گیا تھا۔ کچے صندل میں بھی بے حد خوشبو تھی۔“ باباصاحب جس وقت یہ فرما رہے تھے اسی وقت آپ نے چند ملازم کو بلا کر حجرۂ مبارک سے تسبیح منگوائی اور کہا کہ اس کچے صندل میں اتنی

خوشبو نہیں ہے جتنی کہ اس حجرۂ والی تسبیح میں ہے۔ پھر تسبیح کو دونوں ہاتھوں میں لے کر تھوڑی دیر غور سے دیکھ کر خوب رگڑا اور اپنی سیدھی ہتھیلی کو سنگھا کر پوچھا "کیسی خوشبو ہے؟" اس میں کچھ عود کی سی خوشبو تھی۔ پھر تسبیح کو سنگھایا۔ اس میں بھی خوشبو موجود تھی۔ اس کے بعد فرمانے لگے میرے پاس آٹھ دس تسبیحیں تھیں مگر برہمن لوگ ایک ایک کر کے لے گئے۔

تشریح:۔ ارشاداتِ بالا کی کیا تشریح کی جائے۔ ایک ایک لفظ معنی سے پُر ہے۔ صرف اشارۃً کچھ عرض کئے دیتا ہوں۔ عشق کے سرور اور کیف کو شراب سے تشبیہہ دیتے ہیں۔ اس میں زیر و بم ہوتا ہے اور جوش ہوتا ہے۔ یہی کیفیت جب مقام روح تک پہنچ جائے تو اس میں سکون پیدا ہو جاتا ہے۔ انسان غوطہ زن ہو جاتا ہے۔ ہوش و بیہوشی، جوش و مستی دونوں سے کہیں ماورا ہو جاتا ہے۔ ہوش میں ہوتا بھی ہے اور نہیں بھی ہوتا۔ ایک بہت گہرا نشہ ہوتا ہے۔ یہ تو رہا شراب کا اثر۔ مگر یہ کالی افیون جس کے خون میں پیوست ہو اس پر نہ سانپ کا زہر اثر کرتا ہے نہ کوئی امرت ہی کام کر سکتا ہے۔ یہ بڑی ممسک بھی ہوتی ہے اور انقباض سے بھی ماورا۔ یہ روحانی قوتوں کو منتشر نہیں ہونے دیتی اور ھُو، ھُو، اللہ ھُو کے ساتھ ایک مستقل رشتہ باندھ دیتی ہے جس کو نہ کوئی طاقت توڑ سکتی ہے، نہ بڑھا سکتی ہے، نہ گھٹا سکتی ہے۔

کافی:۔ سرخ سرخ گچھے، اجتماعِ اُمت، جسم کی مشین میں ذرک کی کَٹ کَٹ کَٹ۔ بوریوں میں ڈال کر صاحبِ خدمت کے پاس جانچ پڑتال اور پھر تھوڑی سی ریاضت کی سینک اور پسائی کے بعد یہ افراد خدمت خلق کے قابل بنا دیئے جاتے ہیں۔

صندل:۔ جیسے شیر اور ہاتھ دونوں حیوانات کے باشاہ ہوتے ہیں ویسے ہی صندل کا درخت جنگل میں نباتات کا بادشاہ ہے۔ نازک بھی ہوتا ہے اور حیدری قوت بھی رکھتا ہے اس کی خوشبو اور مستی اس کی دلآویزی اور پائیداری جو زمین سے علیحدہ ہو کر بھی اپنی خوشبو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جاری رکھتا ہے۔ یہ انعام تو کچھ کلمہ گو فقراء ہی کا حصہ ہے۔ اور وہ آٹھ صندل کے درخت نامعلوم کس کی طرف اشارہ تھا۔ اسی طرح صندل کی تسبیح۔ عرس کے موقع پر صندل کا نکالنا۔ جھنڈے پر صندل کے ہاتھ کا نشان۔ واللہ اعلم ان اشارات کے کیا معنی ہیں۔

۴۔ حق کی تلاش:

باباجان اکثر فرمایا کرتے ہیں۔ "تم کو حق کی کیا تلاش ہو گی۔ حق کو تمہاری تلاش ہے۔"

تشریح:۔ یہ بات کچھ حُسن کی ذات میں داخل ہے کہ خلق مجھے دیکھنے اور پہچاننے۔ اوپر ذکر آچکا ہے کہ کس طرح دربار عام میں فیض کا بازار کھلا رہتا ہے۔ اور خلقت ہزاروں کی تعداد میں آتی ہے اور جاتی ہے۔ یہ سب کچھ خلق کی صرف خدمت ہی نہیں ہے

بلکہ اس ذریعہ سے لوگ آپ کے پاس آتے ہیں۔ لوگوں کو خود پتہ نہیں ہوتا کہ سچ مچ چاہتے کیا ہیں۔ کبھی ادھر دوڑتے ہیں اور کبھی اُدھر دوڑتے ہیں۔ اور ان ہزاروں سے جس کسی میں صلاحیت دیکھی اُسے چُن لیا جاتا ہے، کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے۔ آئے دن یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ ہر قسم کے لوگ آتے ہیں۔ لاعلاج بیماریوں کی شفا کے لئے یا مالی مشکلات کے حل کے لئے یا اولاد کے لئے۔ چاہے وہ باتیں پوری ہوں یا نہ ہوں وہ خود کچھ اور ہو جاتے ہیں۔ یہ جو خدمت کا بازار گرم ہے جہاں دینوی اعتبار سے ہزاروں لاکھوں کا بھلا ہوتا ہے۔ اس کا اصل مقصد تو خالصتاً یہ معلوم ہوتا ہے کہ حق کا بول بالا ہو۔ تب ہی تو آپ فرماتے ہیں۔ ”تمہیں حق کی کیا تلاش ہو گی خود حق کو تمہاری تلاش ہے۔“

ایک دفعہ دربار میں حسب معمول کاموں سے فراغت پا کر رات کے تقریباً بارہ بجے چند خادم آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔ موضوع یہ تھا کہ رسمی پیر تو بہت سے ہیں جو مریدوں سے سخت محنتیں کرواتے ہیں اور ملتا کچھ نہیں اور سچے پیر آج کل کی دنیا میں کسی خوش نصیب ہی کو ملتے ہیں اور بہت کمیاب ہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ گفتگو حضرت قبلہ کی قیام گاہ سے کافی فاصلہ پر ہوئی تھی۔

صبح ناشتہ پر بابا صاحب قبلہ نے دوہہ نہایت ہی پیارے انداز سے پڑھا۔

پیاس نہ جانے دھوبی گھاٹ　　بھوک نہ جانے جھوٹا بھات

نیند نہ جانے ٹوٹا کھاٹ　　پریت نہ جاتے جات و پات

پھر جوش میں آکر فرمانے لگے کہ اگر طلب ہو تو دینے والا جھک مار کر دیتا ہے۔

ایک دن زمانہ حال کی روش پر ارشاد ہوتا ہے۔

سچی پریت کنول بھیئو　　جل سُوکھے جل جائے

جھوٹی پرید بگلا بھیئو　　جل سُوکھے اُڑ جائے

کس قدر سچ کہا ہے۔ آج کل کے زمانہ میں چہ دنیا چہ دین ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر بگلہ کی طرح مشغولِ حق ہوتے ہیں۔ اور جہاں سادہ لوح مچھلی پاس سے گزری اسے ہڑپ کر گئے نفس کی طلب میں ہی لینا ہی لینا ہوتا ہے، چہ دنیا چہ دین۔ اور دل کی طلب میں دینا ہی دینا ہوتا ہے، چہ دنیا چہ دین۔

ارشاد:۔ آج کل کی دنیا میں سب ندی نالے، اور پہاڑی چشمے سوکھ گئے ہیں۔ عرب کی زمین بھی عجب زمین ہے وہاں صحرا ہی صحرا چٹیل ریگستان اور کہیں کہیں نخلستان ہوتا ہے جس میں پانی کے چشمے اور اس کے ارد گرد کھجور کے درخت ہوتے ہیں۔ یہ چشمے بیس گز چالیس گز لمبے چوڑے ہوتے ہیں۔ اور ان مین اتنا پانی ہوتا ہے کہ ہزاروں اونت بھی ایک وقت میں سیر ہو کر پئیں تو بھی اس میں کمی نہیں آتی۔ ان چشموں میں پانی زمین دوز نہروں کے ذریعہ پہنچتا ہے۔ جنہیں ظاہر کی آنکھ دیکھ نہیں سکتی۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ جہاں بظاہر چشمہ نظر بھی نہ آئے اونٹ سونگھ کر بنا دیتے ہیں اور ایک بالشت یا ایک ہاتھ کھودنے سے پانی نکل آتا ہے۔ اونٹ بھی عجب جانور ہے۔ اسے ship of desert یعنی صحرا کا جہاز کہتے ہیں۔ یہ بہت بوجھ دلاتا ہے۔ بظاہر اپنی استعداد سے کہیں زیادہ بھوک اور پیاس کی بے انتہا برداشت ہوتی ہے۔ جہاں ملا، جتنا ملا کھا پی لیا۔ نہیں ملا تو ہفتوں پرواہ نہیں۔ ویسے تو نہایت بے ضرر اور دوستانہ ہوتا ہے۔ مگر کبھی کبھی انسان کی کھوپڑی بھی چبا جاتا ہے۔

کھجور کے درخت میں عجب صفات ہیں۔ جو نشانیاں، الف اللہ کی طرح قیام کئے ہوتا ہے نہ اس میں شاخیں ہوتی ہیں، نہ کچھ خاص سایہ۔ اس کے پھل اتنی اونچائی پر ہوتے ہیں جو چڑھنا جانتے ہوں وہی پہنچ سکتے ہیں۔ کسی سیڑھی سے بھی ان تک پہنچ نہیں ہو سکتی۔ کھجور کے بیج سے بھی اور درخت لگائے جاسکتے ہیں مگر تخمی ہوتے ہیں۔ کھجور کے قلم تو لگائے نہیں جاتے۔ مگر اس میں بھی وہی زمین دوز کمال ہوتا ہے۔ اس کی جڑیں جو دور دور تک پھیلی ہوتی ہیں۔ ان میں سے بچے اُبھر آتے ہیں۔ اور اس طرح نخلستان آباد ہوتا ہے۔ یہ زمین دوز چشمے، یہ نخلستان، یہ اونٹوں کا بوجھ اٹھانا اور صحرا کے سفر طے کرنا نامعلوم کسی باطنی نظام کی طرف اشارہ ہے۔

سبحان اللہ قلندری کی بھی کیا شان ہے

مندرجہ بالا بیان میں صرف دو چار باتیں مقصد کی وضاحت کے لئے لکھ دی گئی ہیں۔ اگر سارے ارشادات کو جمع کیا جائے تو کئی جلدوں میں بھی یہ کام مکمل نہ ہو سکے۔ ایک اور ارشاد فقراء کے لئے ایسا ہے جس کا لکھنا ضروری ہے۔

۵۔ فقراء کے لئے:

کبھی اس کا خیال نہ کرنا کہ ہم کہاں پہنچے۔ کس مقام پر ہیں، یا کیا ملا؟ صرف اس بات کو دیکھو کہ میں کس حد تک فنا ہوا۔ مجھ میں کیا مَیں باقی ہے؟ حق کو پانے کا یہی راز ہے۔

بابا جان اکثر ارشاد فرماتے ہیں۔ میرا دل مٹھی میں ہے۔ بزرگانِ دین کی ہر بات رمز سے پُر ہوتی ہے۔ یہ وہ مقام ہوتا ہے جس کی بابت غوث الاعظم نے فرمایا تھا کہ ایک حد پر عشق بے حجاب ہو جاتا ہے۔ یہ خود آگہی کی انتہا ہوتی ہے۔ خود آگہی تو خیر آگے

کی بات ہے۔ جس نے روح کے مقام کی لذت دیکھ لی ہو وہ واپس نہیں آتا۔ پھر خود آگہی کے باوجود عبد بننا ایک کامل بندہ ہی کا مقام ہو سکتا ہے۔ ہم لفظ عبد سے سمجھتے ہیں کہ بندہ کا کام حکم ماننا ہے اور حکم کو ہم سمجھتے ہیں کہ ایک خارجی چیز ہے، تابعداری ہے۔ مگر جو محبوب کے اشارہ کو پہچانتا ہے اس سے پوچھیں حکم کی لذت۔ عبد بننا آسان نہیں۔ عبد وہ ہے جس کے ہاتھ کٹے ہوئے ہوں۔ عبد خود آگاہ ہوتا ہے۔ یہ لفظ خود آگاہی سوائے ذاتِ باری کے اور کسی پر چسپاں ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ کائنات کا وجود اور تخلیق تفسیر ہے خود آگہی کی۔ ارشاد باری ہے۔ زمین کُل کی کُل میری مٹھی میں ہو گی۔ قیامت کے دن۔ یہ تخلیق اور کن فیکون والی بات ہے۔ کچھ دمادم والی بات ہے۔ اس مقام کا تخیل بھی فقیر نہیں کر سکتا۔ نہ اس کی صدا سُن سکتا ہے جب تک کہ اس کی فقیری تلوار کی دھار والی بات نہ ہو۔ یعنی دمادم قلندری۔

دل حریم ہے۔ دل جملہ عشق ہے۔ دل جملہ تخلیق ہے۔ اس کو مٹھی میں سمالینا تخلیق کو مٹھی میں سمالینا ہے۔ یہ مقامِ خود آگہی سے ہی ہو سکتا ہے۔ کُل زمین کا قیامت کے دن مٹھی میں ہونا قیام ہو جانے والی بات ہے۔ دائم، قائم، قادر کی تفسیر ہے۔

اس عشق کی دائم منزل میں اس کیف کی دائم دنیا میں

تو دائم قائم قادر ہے، سبحان اللہ، سبحان اللہ

سنہ ۱۹۵۴ء میں حضور نے ایک خادم کو لنگوٹ باندھنے کے لئے فرمایا۔ انہوں نے لنگوٹ سلوا لئے اور باندھنے شروع کئے۔ پھر بھی بابا جان وہی فرماتے رہے۔ برسوں بعد بات سمجھ میں آئی کہ لنگوٹ باندھان دم کو کہتے ہیں۔ چاہے خیالات ہوں یا جنسی تعلق۔ تین منٹ سے زیادہ تسلسل نہیں رہتا۔ مرد اس کو کہتے ہیں جس کا دم نہ ٹوٹے۔ رات ہو یا دن۔ پھر ظاہر یا خفی ذکر کا ہی نہیں بلکہ تحت الشعور میں بھی۔ اور یہ ہی نہیں بلکہ ہر نفس پچھلے سے تیز تر۔ یہ ہے دمادم مست قلندر۔

الغرض بابا صاحب کے بیان میں خاص بات یہ دیکھی گئی ہے کہ اگرچہ بات نہایت سیدھی سادی ہوتی ہے مگر دل میں تیر کی طرح اُتر جاتی ہے اور وہیں بس جاتی ہے۔ نہ دماغ میں کوئی بحث پیدا ہوتی ہے نہ اجھن۔ بس دل مان لیتا ہے اور وہ بات اپنی ہی ہو جاتی ہے۔

دیکھنا تقریر کی لذت کو جو اس نے کہا

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

(غالبؔ)

دوہے

تن چرخا من روئی پریم کے تار بنائوں

برَہ کھڈی چولا بُن کر پیتم کو پہنائوں

جن نینوں سے پیتم دیکھے وہ نیناں مت کھول

دھیرے دھیرے سپنا بن جا اپنے من میں ڈول

(رحمن بابا)

بندے اپنا آپ نہ جان

تن کٹیا میں ہے بھگوان

ادم ہی ادم ہے سارا جیون　　'میں' 'تو' کا چھایا اندھیارا

آنکھ مچولی کھیلے پیارا　　كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَانٍ

بندے اپنا آپ نہ جان

تن کٹیا میں ہے بھگوان

نیارے نیارے کھیل رچائے چنچلتا سے من بہلائے

آپ بگاڑے آپ بنائے اپنے گھر اپنا مہمان

بندے اپنا آپ نہ جان

تن کٹیا میں ہے بھگوان

سب سنسار میں آپ بھیووہ بہن، بھائی، ماں، باپ بھیووہ

پوجا پاٹ اور جاپ بھیووہ جھوٹا ہے سب تیرا گیان

بندے اپنا آپ نہ جان

تن کٹیا میں ہے بھگوان

پنڈت بن کے پاپ کٹاوے مُلا بن قرآن پڑھاوے

کرموں کا پھر جال بچھادے رَبُّكُمَا تُكَذِّبَانِ

بندے اپنا آپ نہ جان

تن کٹیا میں ہے بھگوان

بُرے بھلے میں آپ سمایو دین دھرم کا ڈھونگ رچایو

سیدھی بات کو بھید بنایو پیالی میں اُٹھا طوفان

بندے اپنا آپ نہ جان

تن کٹیا میں ہے بھگوان

جیو تیرا ہے پریم کا پتر انگ انگ ہے اکشر اکشر

جس کو پڑھ لیھ رام منوہر　　اس کا دوجگ میں کلیان

بندے اپنا آپ نہ جان

تن کٹیا میں ہے بھگوان

کیوں رحمن ہے تو الجھن میں　پریم کی جوت جگالے من میں

ہری درشن کر گُر درشن میں　ہر گُر دونوں ایک سمان

بندے اپنا آپ نہ جان

تن کٹیا میں ہے بھگوان

(رحمن بابا)

تصور میں میرے اگر تم نہ ہوتے　　تو یہ زخم دل کے چراغاں نہ ہوتے

جو تم رونقِ برمِ امکان نہ ہوتے　　سپہر بریں ماہ و انجم نہ ہوتے

یہ روئے منور، یہ کاکل بہ عارض　　قدِ نازنیں پر قیامت نہ ہوتے

وہ جلوہ سراپا دکھایا تو ہوتا　　تمہاری قسم ہوش ہوتے نہ ہوتے

تمہاری نظر کے اشارے نہ ہوتے　　تو ہم اک نظر پر تصدق نہ ہوتے

ہر اِک نقش پا میں تمہیں ڈھونڈ لیتے　　یہ کون و مکاں حد سے باہر نہ ہوتے

جو ہم رقص میں مرغِ بسمل نہ ہوتے　　تری بزم کی شمع محفل نہ ہوتے

ولی عشق میں ہوش کھوئے نہ ہوتے　　تو ان کی امانت کے چرچے نہ ہوتے

(ولی الدین)

☆...☆...☆